

دلائل اسنن والآثار

(۷)

از جناب مولوی نجسم الدین صاحب اصلاحی

تقسیم احادیث بجماعت تعریف مندرجہ ذیل ہے :-

(۱) قوی (۲) فعلی (۳) تقریری (یعنی آپ کا کسی بات کو سن کر یا فعل کو دیکھ کر اسے جائز رکھنا) اور تقسیم احادیث بجماعت تعداد روایوں ہے :-

(۱) متواتر (۲) احاد (۳) مشہور (۴) عزیز (۵) غریب -

پھر حالات راویان کے اعتبار سے تین قسمیں قرار پاتی ہیں :-

(۱) مردود جبکی تین قسمیں ہیں موضوع، متردک، منکر

(۲) ضعیف جبکی چار قسمیں ہوتی ہیں (۱) منقطع، (۲) معضل (۳) معلق (۴) مرسل -

(۳) مقبول جبکی دو قسمیں ہیں :- ایک حسن، دوسری صحیح، ان میں سے بعض کے متعلق کسی قدر

تفصیل کی ضرورت ہے -

خبر متواتر خبر متواتر سے قریب قریب ویسا ہی علم یقین حاصل ہوتا ہے جیسے آنکھوں سے دیکھنا -

اس دعویٰ پر قرآن مجید شاہد ہے۔ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰى الْفَيْلِ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ

رَبُّكَ بِاَصْحٰى الْفَيْلِ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰى الْفَيْلِ اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰى الْفَيْلِ

انہوں نے یہ واقعات خود دیکھے تھے، صرف متواتر خبروں سے ان کو اطلاع پہنچی تھی۔ مگر قرآن اس

علم کو روایت سے تعبیر کرتا ہے۔ یہیں سے یہ لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ تواتر سے جو علم حاصل ہو اس کی حیثیت مشاہدہ کی سی ہے۔

اقسام تواتر (۱) تواتر اسناد یعنی جس خبر کی سندیں بلا تعین کثیر ہوں، اس قدر کہ عادتاً اتنے راویوں کا جھوٹ پر اتفاق کرنا یا ان سے اتفاقیہ جھوٹ صادر ہونا محال ہو، اور یہ کثرت ابتدا سے انتہا تک یکساں ہو، کسی مرحلہ میں راویوں کی تعداد کم نہ ہو، اور خبر مفید علم ضروری ہو اور اس کا تعلق کسی ایسے معاملہ سے ہو جو محسوس ہو۔ عامہ محدثین کے نزدیک اپنی شرائط پر تواتر کا تحقق موقوف ہے، اور ایسی خبر متواتر علم الاسناد کے دائرہ بحث سے خارج سمجھی جاتی ہے اس لیے کہ علم الاسناد میں صحت یا ضعف حدیث سے بغرض وجوب عمل یا ترک عمل جو بحث کی جاتی ہے وہ بحیثیت رجال ہوا کرتی ہے، اور خبر متواتر کا حال یہ ہے کہ وہ کسی بحث و حجت کے بغیر واجب العمل سمجھی جاتی ہے۔

(۲) تواتر طبقہ جسکو تواتر لفظی بھی کہا جاتا ہے، مثلاً قرآن مجید، کہ وہ لفظ بلفظ ایک نسل سے دوسری نسل تک متواتر چلا آ رہا ہے۔ یہ تواتر ایسا تواتر ہے کہ محدثین کے اصول کے مطابق اسکے لیے اسناد کا منضبط ہونا مشکل بھی ہے اور غیر ضروری بھی، اس لیے کہ اسناد کی ضرورت خبر احاد میں ہوتی ہے جہاں شک اور ظن کا امکان ہوتا ہے نہ کہ ایسی متواتر چیز میں جو لفظاً لفظاً کثیر التعداد آدمیوں سے کثیر التعداد آدمیوں تک منتقل ہوتی چلی جا رہی ہو۔ اس تواتر لفظی میں الفاظ بھی یکساں اور متواتر ہوتے ہیں اور اس تعریف کی رو سے خبر متواتر دو تین سے زائد نہیں ہیں۔ غالباً اسی قسم کی خبر متواتر کے متعلق ابن صلاح وغیرہ کا خیال ہے کہ بہت ہی قلیل الوجود عدیم النظیر ہے۔

(۳) تواتر عمل یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانے سے آج تک ایک جم غفیر برابر کسی امر دینی پر عمل کرتا رہا ہو، جس کا عادتاً جھوٹ یا غلطی پر اتفاق کرنا محال ہو، مثلاً پانچ وقت کی نماز اور رمضان کے روزے کہ ان پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے آج تک متواتر عمل ہو رہا ہے، کبھی اس عمل میں کوئی فصل یا

التواہنیں ہوا، چین سے لیکر مراکش تک کروڑوں مسلمان نسلاً بعد نسل اس عمل کو یونہی کرتے چلے آ رہے ہیں، اور آج کسی شخص کے لیے یہ دعویٰ کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ وقت کی نماز نہیں پڑھی یا پورے رمضان کے روزے نہیں رکھے۔ زکوٰۃ، حج اور قربانی وغیرہ اعمال بھی اسی قبیل کے متواتر اعمال ہیں، اور یہ تو اتران کے سنت نبوی ہونے کی ایسی یقینی دلیل ہے کہ ایک عقل باختہ و ہوش ربودہ آدمی کے سوا کوئی اس میں شک نہیں کر سکتا۔

(۴) تواتر قدر مشترک جبکو تواتر معنوی کہا جاتا ہے وہ خبر ہے جسکی روایت میں تمام راویوں کے الفاظ گو یکساں نہ ہوں مگر تمام مختلف الفاظ میں ایک معنی و مفہوم مشترک ہو۔ مثلاً کوئی یہ بیان کرے کہ حاتم نے نٹو دینار دیئے، دوسرے نے کہا کہ نٹو اونٹ دیئے، تیسرے نے ۲ گھوڑے بیان کیے اور یہ سلسلہ حد تواتر کو پہنچ گیا۔ یہ سب اخبار کم از کم اس ایک امر میں مشترک ہیں کہ حاتم نے اپنے مال میں سے کچھ ضرور دیا جو اسکی سخاوت کی دلیل ہے۔ اس قسم کے تواتر میں ایک ایک واقعہ تو اپنی جگہ یقینی نہیں ہوتا، مگر مجموعی حیثیت سے جو معنی ان سب خبروں میں مشترک ہوتا ہے وہ ضرور یقینی ہوتا ہے۔ مثلاً آنحضرت صلعم سے معجزات کا صدور، آپ کے غزوات و سیر، اسلام کے ضروری احکام، اوامر و نواہی وغیرہ کی روایات، اگرچہ یہ مفرد اور احاد طریقہ پر ہوں تاہم قدر مشترک متواتر قطعی ہے۔

حدیث متواتر کے موجود ہونے پر روشن دلیل یہ ہے کہ کتب احادیث، جو علمائے عصر میں متداول ہیں ان کا انتساب جن مصنفین کی طرف کیا جاتا ہے یہ ایک یقینی قطعی امر ہے۔ پس یہ مصنفین اگر انہیں کتابوں میں متفق ہو کر ایک حدیث کو اس قدر روایات سے روایت کریں کہ عادتاً نہ ان کا جھوٹ پر اتفاق کرنا اور نہ ان سے اتفاق جھوٹ صادر ہونا ممکن ہو تو بلا شک یہ حدیث متواتر ہوگی اور ضرور اسکا انتساب قائل کی طرف بطور علم یقینی ہوگا۔ اسی قسم کی احادیث کتب مشاہیر میں بکثرت موجود ہیں چنانچہ حدیث مسح خفین، و حوض کوثر، تقریباً ستر صحابہ سے مروی ہے، بنائے مساجد کی احادیث انہی صحابہ

سے اور آنحضرت صلعم کی طرف جھوٹی حدیث کی وعید متواصحابہ، نیز حدیث شفاعت چابلیش سے زیادہ صحابہ سے مروی ہے، حدیث ویل للاعقاب من الناس، اور حدیث لا نورث ما ترکنا صدقہ اور انزل القرآن علی سبعة احرف و حدیث الحساب و حدیث النظر الی اللہ تعالیٰ و حدیث غسل الرجلین فی الوضوء و حدیث عذاب القبر وغیرہ کو ابن جوزی وغیرہ نے متواتر فرمایا ہے۔

اوپر جو یہ لکھا گیا ہے کہ ”خبر کا تعلق کسی ایسے معاملہ سے ہو جو محسوس ہو“ سو اسکا مفہوم یہ ہے کہ راوی یوں کہے رأیت رسول اللہ صلعم فعل کذا یا سمعت رسول اللہ صلعم قال کذا یعنی میں نے حضور کو ایسا کرتے دیکھا، یا آپ کے ایسا کہتے سنا۔ اس قسم کی خبر متواتر ہو سکتی ہے۔ رہی خبر جس کا تعلق محض عقل سے ہو مثلاً وجود مانع تو یہ متواتر نہیں ہو سکتی۔

علم کی دو قسمیں ہیں ضروری اور نظری۔ ضروری وہ علم ہے جو قیاس عقلی کے بغیر حاصل ہو مثلاً جس چیز کو آپ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اس کا علم آپ کو محض مشاہدہ سے حاصل ہو جاتا ہے اور اسکے لیے قیاس عقلی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بخلاف اسکے نظری وہ علم ہے جو بذریعہ نظر حاصل ہو۔ معنومات یا منظونات میں ترتیب دینے کو نظر کہتے ہیں جس سے مجہول شے کا علم یا ظن حاصل ہو۔ اور اعتقاد قطعی واقعی کو یقین کہا جاتا ہے۔ اشاعرہ میں سے امام الحرمین اور مختزل میں سے ابو الحسین بصری و کعبی کا قول ہے کہ خبر متواتر سے علم یقینی ضروری حاصل نہیں ہوتا بلکہ نظری ہوتا ہے۔ مگر قول صحیح یہی ہے کہ خبر متواتر مفید علم یقینی ضروری ہوتی ہے، اس لیے کہ خبر متواتر سے عوام کو بھی حتمی نظر کی صلاحیت نہیں ہوتی علم حاصل ہوتا ہے۔ اگر متواتر مفید علم نظری ہوتی تو عوام کو اس سے کیونکر علم حاصل ہوتا۔ مذکورہ اشاعرہ

۱۰ فوائد الرحموت شرح سلم الثبوت وغیرہ

۱۱ المستصغنی الغزالی۔

کو سمجھنا کہ ظن و تخمین کی راہ مسدود اور علم و یقین، طمانیت و شرح صدر اور مشاہدات و قطیعت کا فتح باب ہو، پس فرمایا کسی عارف نے،

ہزار نکستہ باریک تر و سوائیں جاہت نہ ہر کہ سہ تیرا شد قلندری داند

خبر احاد استواتر کے سوا خبر کی بقیہ قسم یعنی مشہور، مستفیض و عزیز اور غریب سب کو اخبار احاد کا ہر ایک کو خبر واحد کہا جاتا ہے مشہور و عزیز و غریب حقیقتہً خبر احاد کی قسمیں ہیں۔ مگر لغتہً خبر واحدہ ہے جسے ایک ہی شخص روایت کرے۔ اور اصطلاحاً وہ ہے جس میں متواتر کی کل شرطیں موجود نہ ہوں۔ اس قسم کی خبروں میں بعض مقبول ہوتی ہیں اور بعض مردود۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا واجب العمل ہونا ان کے راویوں کے حالات پر مبنی ہے۔ اگر راویوں میں اوصاف قبولیت کے موجود ہوں تو ان کی خبر کی صداقت کا گمان غالب ہوگا اور وہ واجب العمل ہوگی۔ اور اگر اوصاف مردودیت موجود ہوں ہو تو کذب کا گمان غالب ہوگا اور وہ متروک العمل سمجھی جائیگی۔ اور اگر روایات میں قبول و رد کے اوصاف کوئی بھی موجود نہ ہوں مگر قرینہ قبولیت کا موجود ہو تو خبر مقبول ہوگی ورنہ رد کر دی جائیگی۔ اور اگر کوئی قرینہ بھی نہ پایا جائے تو توقف کیا جائیگا اور یہ توقف محض اوصاف عدم قبولیت کی بنا پر ہوگا۔

اخبار احاد میں سے جن خبروں کو قبول کیا جاتا ہے ان کی ذاتی حیثیت تو اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ ان سے کسی دائقہ کے ہونے یا نہ ہونے کا محض گمان غالب حاصل ہوتا ہے، لیکن جبکہ ان کی مدد پر قرآن موجود ہوں تو بقول مختار وہ مفید علم یقینی نظری ہوتی ہیں۔ گو بعض نے اسکا انکار بھی کیا ہے مگر حقیقت یہ نزاع لفظی ہے۔ اصل یہ ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں کسی بات کو جب ”ذوقی“ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اسکی صحت کا پہلو راجح اور شک کا کمزور ہے۔ اسی لیے خبر احاد پر عمل کرنا واجب ہے جب تک کہ وہ قرآن یا رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنت کے خلاف نہ ہو۔ پس جو لوگ کہتے ہیں کہ خبر احاد مفید علم ہوتی ہیں وہ علم سے علم نظری مراد لیتے ہیں۔ اور جو

کہ یہ حدیث بھی مفید علم نظری ہوتی ہے۔

(۳) وہ حدیث جو غریب نہ ہو اور جس کے سلسلہ سند میں تمام روایات ائمہ حفاظ ہوں مثلاً ایک حدیث کی روایات امام احمد بن حنبلؒ نے ایک اور شخص کے ساتھ امام شافعیؒ سے کی پھر امام شافعیؒ نے ایک اور شخص کے ساتھ امام مالک سے اسکی روایت کی۔ سو بیشک یہ حدیث بھی مفید علم نظری ہوگی، ایسے کہ ان روایات میں ایسے اوصاف قابل قبول موجود ہیں جن کے سبب یہ روایات ایک جم غفیر کے قائم مقام ہو سکتے ہیں جو شخص فن حدیث میں تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اگر امام مالک کی زبان سے کوئی روایت سنے تو کبھی اس کی صداقت میں شک نہ کرے گا، البتہ احتمال سہو خطا باقی رہتا ہے، مگر جب ان کے ساتھ ان کا ہم پل ایک اور شخص بھی روایت میں شریک ہو گیا تو یہ احتمال بھی رفع ہو جائیگا۔ یہ تین قرینے ہیں جن کے مل جانے سے خبر واحد مفید علم نظری ہوتی ہے۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی حدیث میں تینوں قرائن مجتمع ہوتے ہیں۔ پھر تو اسکے مفید علم نظری ہونے میں کچھ بھی شبہ باقی نہیں رہتا۔ البتہ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ خبر واحد مع قرائن مفید علم نظری تو ہوتی ہے مگر صرف اسی شخص کے لیے جسے فن حدیث میں تبحر اور راویوں کے حالات واقفیت ہو، اور جو علل قածہ کو بھی جانتا ہو۔ ورنہ جو شخص ان امور سے نا بلد ہو اسکے لیے اخبار احاد مذکورہ مع قرائن مفید علم نظری نہیں ہو سکتیں۔

مفہوم ظن | اوپر لکھا جا چکا ہے کہ محدثین و فقہاء جو حدیث کو ظنی کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ صحت کا پہلو راجح اور شک کا کمزور ہے اور اس بنا پر یہ بالکل معقول بات ہے کہ ایسی خبر جب قرآن اور ثابت شدہ سنت رسول کے خلاف نہ ہو تو وہ عقلاً و نقلاً واجب العمل ہونی چاہیے۔ بعض حضرات کو لفظ ظن سے دھوکا ہو گیا، یا بالقصد تدلیس و تلبیس کام لیکر عوام کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا انہیں عین خدا دین و ملت نظر آیا۔ چنانچہ انہوں نے آیت **إِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا** اور اسی مضمون

کی دوسری آیات کو حجت بنا کر احادیث نبوی کے سارے دفتر پر خط نسخ پھیر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض یوں زودہ اشخاص و رجال اس سیلاب میں بہہ نکلے اور بعض کم علم بدظنی میں مبتلا ہو گئے۔ مگر قرآن کا یہ زندہ معجزہ ہے کہ جب کوئی شخص اس کی آیات کو اس کے مقصود کے خلاف استعمال کرتا ہے تو وہ خود اس کی تردید کر دیتا ہے۔ اب تک کے تجربات اس پر گواہ ہیں، حتیٰ کہ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لہٰذا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید ہی سے مفہوم لفظ ظن کا سراغ لگایا جائے۔

قرآن مجید کی آیات کا تفسیر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہر اس راۓ، عقیدہ یا خیال کو لفظ ظن (دگمان) سے تعبیر کرتا ہے جو حقیقت کے مرتب مشاہدہ کے بجائے دلائل اور قرائن کی بناء پر قائم ہو۔ یہ ظن کا عام مفہوم ہے، اور اس مفہوم کے اعتبار سے قرآن نے مطلقاً ہر ظن کو غلط اور ہر ظن کی پیروی کو مذموم نہیں ٹھہرایا ہے، بلکہ ظن کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں اور ہر قسم کا حکم الگ ہے۔ مثلاً:

(۱) ظن کی ایک قسم وہ ہے جو بالکل علم حق کے مطابق ہے، چنانچہ فرمایا اَلَّذِينَ يَتَّبِعُونَ اَهْلَ مِلَّةٍ قُلُوبًا سَرَّحَهُمْ جَوَلُوكَ اَمَانَ رَكْعَتِهِمْ کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں) یہ عقیدہ کہ انسان اپنے پروردگار کے پاس جانے والا ہے اگرچہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے ظن ہی ہے، لیکن کون یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اس ظن کے اتباع کو قرآن کریم مذموم ٹھہرتا ہے یا اس پر اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا کا اطلاق ہوتا ہے؟

(۲) دوسری قسم کا ظن وہ ہے جو کسی مضبوط دلیل یا قرینے کی بناء پر پیدا ہوا، جیسے فَظَنَ دَاوُدُ اَعْتَاَفَتَاہُ (داؤد نے گمان کیا کہ ہم نے اس کی آزمائش کی ہے)۔ اس قسم کے ظن کی پیروی کرنے کو قرآن نہ صرف تحسن قرار دیتا ہے، بلکہ بعض حالات میں اس کی پیروی نہ کرنے پر سخت ملامت بھی کرتا ہے چنانچہ واقعہ انک کے سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ لَوْ لَا اِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَبَرًا۔ یعنی جب تم نے حضرت عائشہ کے متعلق یہ تہمت سنی، تو ام المؤمنین کی پاک سیرتی

کے جو قرائن موجود تھے ان کی بنا پر مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے دلوں میں نیک گمان کیوں نہ کیا؟ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب ایسے قرائن اور دلائل موجود ہوں جو کسی امر کا گمان غالب پیدا کرنے کے لیے کافی ہوں تو اس گمان کی پیروی کرنا نہیں بلکہ نہ کرنا برا ہے۔ آیت
 اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ عَنْ الْحَقِّ شَیْئًا مَا تَعْلَقُ اس قسم کے گمان سے بھی نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نہیں ہو سکتا۔

د) تیسری قسم کا ظن وہ ہے جو کسی دلیل و حجت پر مبنی نہ ہو بلکہ محض ادھام اور بے اصل قیاسات پر مبنی ہو۔ جیسے وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَ اِذْ قَامَ اللّٰهُ کے متعلق طرح طرح کے گمان کرنے لگے، اور فَظَنُّواْ اَنْ لَّنْ نَّجْعِدَ رَحْمَةً لَّکُمْ اِذْ هَرَسْنَا اِسْمَکُمْ اور اسی قبیل سے مشرکین کا یہ گمان بھی ہے کہ اللہ کے سوا دوسرے آلہ بھی موجود ہیں یا اللہ بیٹے بیٹیاں اور بیوی رکھتا ہے۔ گمان کی اسی قسم کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِشْغَارٌ وَّ اُخْرٰی دہ قسم ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ عَنْ الْحَقِّ شَیْئًا یعنی گمان آدمی کو علم حق سے بے نیاز نہیں کرتا، یا گمان علم حق کی قائم مقامی کچھ بھی نہیں کرتا۔

اب ہر صاحب بصیرت آدمی دیکھ سکتا ہے کہ اخبار و احادیث سے جو ظن حاصل ہوتا ہے وہ قرآن کی تقسیم کے مطابق ظن کی تیسری قسم میں تو کسی طرح شمار ہی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ وہ نرا دہی ظن نہیں ہے اور وہ پہلی قسم میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ اعتقادِ یومِ آخری طرح اسکی تائید میں ایسی زبردست جھٹتیں بھی نہیں ہیں جو اسے ایمان و یقین کی حد تک پہنچا دیں۔ لامحالہ اسے دوسری قسم میں شمار کرنا پڑے گا کیونکہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ بنی کا حکم ہم تک ثقہ راویوں کے ذریعہ سے مسلسل سند کے ساتھ پہنچ رہا ہے اور اس روایت کو بڑے بڑے متقی، محقق اور محتاط اماموں نے قبول بھی کیا ہے، تو ہمیں اس امر کا ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے کہ بنی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا حکم دیا ہوگا، اور جب یہی حکم کسی حکم کے متعلق

ظن غالب رائج حاصل ہو جائے تو اسکی پیروی نہ کرنا ویسی ہی بد بختی ہے جیسی بد بختی ان لوگوں کی تھی جنہوں نے ام المومنین کی پاک سیرتی کا ظن غالب پیدا کرنے والے قرائن کی پیروی نہ کی۔

اختصار اور روایت بالمعنی اسنن و آثار نبوی کے سلسلہ میں ایک اہم اصولی بحث روایت بالمعنی کی آتی ہے۔ بد قسمتی سے یہ چیز بھی سخت فتنہ کا سبب بن گئی یا بنا دی گئی ہے، جو تا مثر اصول حدیث سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اصل یہ ہے کہ روایت بالمعنی کے متعلق کتب اصول میں آٹھ مذاہب بیان کئے گئے ہیں، لہذا نفس مسئلہ کے مالہ و علیہ کو سمجھانے کے لیے ہم اس موقع پر بعض فردوی اور اصولی فروق یہاں بیان کرتے ہیں۔

اہل اصول کا اجماعی مسئلہ ہے کہ روایت بالمعنی ایسے شخص کے لیے جائز ہے جو الفاظ کے معانی و مفہام سے پوری طرح واقف ہو اور جو ایسا نہیں ہے اسکے لیے قطعاً ناجائز و حرام ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ علمی ماہر حدیث اگر اپنی زبان میں حدیث کا ترجمہ کرے تو جائز ہے۔ جب الفاظ حدیث کی تبدیلی غیر زبان سے جائز ہوئی تو عربی الفاظ سے بطریق اولیٰ جائز ہونی چاہیے۔ بعض کا قول ہے کہ مرکبات میں نہیں صرف مفردات میں تبدیلی جائز ہے۔ اور بعض یہ فرماتے ہیں کہ جیسے الفاظ حدیث محفوظ ہوں صرف اسی کے لیے جائز ہے کیونکہ جو جود فور تحفظ وہ معنوی تصرف کر سکتا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ جو شخص الفاظ کو بھول گیا مگر اسکے معنی اسکے ذہن میں محفوظ ہیں تو بغرض استنباط حکم صرف اسی کے لیے یہ جائز ہے باقی جبکہ الفاظ محفوظ ہوں اسکے لیے جائز نہیں۔ یہ ساری بحث جواز و عدم جواز کے متعلق تھی۔ مگر اولیٰ اور انسب یہی ہے کہ جبکہ الفاظ حدیث محفوظ ہوں اسکو بلا تصرف حدیث روایت کرنی چاہیے۔ علامہ قاضی عیاضؒ کا قول ہے کہ روایت بالمعنی کا باب بالکل مسدود کر دینا چاہیے تاکہ ناواقف شخص جبکہ واقفیت کا دعویٰ ہو روایت بالمعنی پر مجبور نہ کر سکے۔

پس روایت بالمعنی کے جواز یا روایت بالمعنی کے موجود ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام روایات بالمعنی ہیں۔ دیکھو الفاظ استفتاح، تشہد، ادعیہ، ماثورہ، احادیث صفات، ہوام، الکلم مثلاً انما الاعمال بالنیات، من حسن اسلام المرء ترکہ مکلاً یعیئہ، الحرب خد عدا الخواجر یا اضمآن، العجماء جبار، البینۃ علی المدعی وغیرہ کو روایت بالمعنی کرنا جائز نہیں۔ صحاح و تابعین اور ائمہ مجتہدین میں بہت سے اکابر کا مذہب روایت باللفظ کا ہے۔ غالباً ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر راوی نے الفاظ رسول بعینہ محفوظ رکھے ہیں تو جو فصاحت و بلاغت اور جامعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ہے، وہ دنیا کے کسی کلام میں نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اباب لغت الفاظ کی تحقیق میں جس طرح اشعار عرب اور قرآن سے استدلال و استشہاد پیش کرتے ہیں اسی طرح احادیث نبوی سے بھی کرتے ہیں۔ جنہوں نے صحاح جوہری و لسان العرب کے الفاظ کی تحقیق کی ہوگی وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہونگے۔ ہم اس جگہ امام اللغۃ و الادب جاحظ کا ایک بیان افادہ ناظرین کے لیے اور بالخصوص روایت بالمعنی کے بہانے سے تمام احادیث کو ناقابل اعتماد قرار دینے والوں کی فہمائش کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اہل علم خود فیصلہ فرمائیں گے کہ بحیثیت زبان کلام رسول کا کیا درجہ سرسری اور سطحی طور پر مطالعہ کرنے اور پڑھنے پڑھانے سے یہ چیز نہیں آتی جب تک کہ کافی تیاری اور مطالعہ سے حاصل نہ کی جائے۔ ائمہ لغت جن پر آج ہماری عربی زبان کا دار مدار ہے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے احادیث کو باقاعدہ حاصل نہ کیا ہو یا اسکی حیثیت سے خدمت نہ کی ہو۔ بہر حال جاحظ کہتا ہے:-

”احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایسا ہے جس کے الفاظ کم اور معانی زیادہ ہیں۔ وہ تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔ جہاں بسط کی ضرورت تھی وہاں بسط سے کام لیا ہے اور جہاں اختصار کا موقع تھا وہاں اختصار سے۔ غریب اور غیر معروف الفاظ سے پرہیز کیا ہے۔ گری ہوئی

سوقیانہ زبان کا کہیں نشان تک نہیں پایا جاتا۔ آپ کی ہر گفتگو حکمت و معرفت کی آئینہ دار اور ہر کلام آپ کی قادر الکلامی اور ملکہِ راستہ کا نمونہ ہے۔ یہی ایک ایسا کلام ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے محبت اور حسن قبول کی چاشنی رکھی ہے۔ اس میں میہبت اور حلاوت دونوں کا عجیب امتزاج نظر آتا ہے۔ ایجاز اور قلت الفاظ کے باوجود افہام و تفہیم کی مخصوص اور نمایاں خوبی پائی جاتی ہے۔ آپ کے کلام کا استقصاء کر کے دیکھو کہیں تکرار اور اعادہ نہیں اور اسکے باوجود کہیں کلام میں تشنگی، اظہارِ غا میں نقص یا وہیل و حجت میں ضعف نہیں۔ آپ کے سامنے نہ کسی دشمن کو تاب و مقاومت ہوئی اور نہ کوئی خلیب اپنے اعجازِ بیان کے غرہ میں آپ کو خاموش کرنے کی جرأت کر سکا۔ بلکہ طویل اور مبسوط خطبوں کے مقابل میں آپ کا مخفیہ گرجا مع کلام برتر اور بڑھا ہوا ہے۔ نیز دشمن کو لاجواب کرنے کا اندازِ زیبا بھی آپ کا نرالا ہے۔ آپ حریف کو اسی کی معلومات سے خاموش کرتے ہیں۔ استدلال اور حجت کے لیے محض پچائی آپ کے پیش نظر ہوتی ہے۔ آپ اتنی ہی بات فرماتے ہیں جتنی ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہوتی ہے۔ مخاطب پر جوٹ کرنا اور طنز و تعریض سے کام لینا، یا زبان آوری اور الفاظ کی ڈھٹ بندی سے سامعین کو مرعوب کرنا، یا تقریر میں مبالغہ اور بے جا جوش، اور بات کو حقیقت سے بڑھا کر بیان کرنا آپ کا شیعہ نہیں۔ آپ کو اس کا بھی لحاظ ہوتا کہ اثنائے گفتگو میں نہ بہت زیادہ ٹھہرتے اور رکتے، اور نہ بہت ہی عجلت فرماتے، اور نہ اتنی طویل اور نہ ہی اتنی مختصر گفتگو ہوتی کہ کلام کو عیب اور داغ لگے۔ بہر ان سب محاسن سے زیادہ بڑھ کر سرورِ عالم صلعم کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ آپ کا کلام اتنا منفعت بخش، ایسا بچا تلاء، الفاظ میں ایسی صداقت، اسلوب ادا اتنا خوبصورت اور نکش، سلاست و روانی ایسی اور مقاصد ایسے واضح اور روشن کہ اسکی مثال دھندلے صحنہ کو کندن و کاہ بر آوردن کے مصداق ہے۔ انسانی کلام میں اس کی نظیر دنیا پیش کرنے سے قاصر ہے۔“

علامہ مصطفیٰ صادق رافعی نے بھی اپنی کتاب اعجاز القرآن میں (۲۲۲-۲۲۳) فصاحت و بلاغت کلام نبوی پر بحث فرمائی ہے۔ نیز مصری عالم سید محمود شاہ نے بلاغت نبوی پر ایک مقالہ جولائی ۱۹۳۲ء کے رسالہ المقتطف ص ۱۱۴-۱۱۵ میں سپر و قلم فرمایا ہے جس میں وہ احادیث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلاغت کے انتہائی بلند مرتبہ پر ہے جس تک پہنچنے کی کوشش میں لوگوں کی گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں۔“

خلاصہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی ہوئی تو ضرور ہے مگر احادیث میں اس کا بہت ہی کم حصہ ہے۔ صحیحین اور موطا امام مالک کے پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اندر روایت باللفظ کا زیادہ حصہ موجود ہے۔ ایک صاحب ذوق آدمی ان احادیث کو پڑھ کر خود محسوس کر سکتا ہے کہ ان میں جو شان کلام پائی جاتی ہے وہ اپنے قائل کی بلند شخصیت کا صاف پتہ دے رہی ہے۔ کم تر شخصیت کے لوگوں کی زبان اس سے اتنی مختلف ہوتی ہے کہ دونوں کا فرق کسی ناقدانہ بصیرت رکھنے والے سے چھپ نہیں سکتا۔

حذف و اختصار احادیث کے مفرد یا مرکب الفاظ میں سے کچھ الفاظ کو گھٹا کے اختصار کرنا یا بعض الفاظ کو ان کے مترادف سے بدل دینا بالکل ناجائز ہے۔ البتہ جو شخص الفاظ کے معانی، اور قریب المعنی الفاظ کے باہمی فروق کو جانتا ہو اور جس میں یہ سمجھنے کی تمیز ہو کہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنے سے معنی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اسکے لیے بقول اصح اختصار و ابدال دونوں جائز ہیں۔ اختصار حدیث کو محدثین نے جائز رکھا ہے مگر بایں شرط کہ اختصار کرنے والا صاحب علم ہو اس لیے کہ صاحب علم بغرض اختصار یا توان الفاظ کو حذف کرے جن کا بقیہ حدیث سے کچھ تعلق نہ ہوگا یہاں تک کہ بحیثیت دالت و بیان ہر ٹکڑا ایک مستقل خبر قرار دیا جاسکتا ہو یا پھر وہ ان الفاظ کو حذف کرے جن پر بقیہ حدیث دلالت کرتی ہو۔ بخلاف جاہل کے کہ وہ استثنائے وغیرہ الفاظ کو بھی حذف کر دے گا جبکہ بقیہ حدیث سے پورا تعلق ہوگا۔ (باقی آئندہ)